بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ (5:67)

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

مغربی ممالک کے دانشور، وہاں کے مختلف علمی اور فکری اداروں کے ریسرچ سکالرز، یا یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلباء، اسلام کے متعلق جب کبھی کچھ دریافت کرنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ آخر میں وہ ایک سوال ضرور کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر اسلام ایسا ہی انسانیت ساز اور منفعت بخش نظام حیات تھا تو وہ تھوڑا سا عرصہ قائم رہنے کے بعد ناکام کیوں ہو گیا۔ وہ آگے کیوں نہ چلا؟ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ یہی خیال ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی عام ہو رہا ہے، اور میرا اندازہ یہ ہے کہ اسے ایک خاص مقصد کے تحت منظّم طور پر پھیلایا جا رہا ہے۔ مغربی مفکر اپنے خیال کا اظہار کچھ نرم انداز سے کرتے ہیں لیکن ہمارے یہ نوجوان بڑی جرأت و بیباکی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے تاریخ کے ایک خاص دور میں اس قسم کے درخشندہ نتائج پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن اس کے بعد زمانہ آگے بڑھ گیا، حالات بدل گئے۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے، اب اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا ہمیں اس خوش فہمی سے نکل جانا چاہئے کہ ہم اسلام کو ساتھ رکھتے ہوئے زندہ رہ سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں۔ یہ ہیں وہ خیالات جن کا اظہار ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے بہ شدومد کیا جاتا ہے۔ میں اپنے ان نونہالان ملت کے اس قسم کے خیالات پر نہ ناک بھویں چڑھایا کرتا ہوں، نہ ہی انہیں لاحول پڑھ کر دھتکارا کرتا ہوں۔ میں ان حالات کا جائزہ لیا کرتا ہوں جن کی بنا پر ان کا دل اس قسم کے وساوس کی آماجگاہ اور ان کا دماغ اس قسم کے شکوک کا مسکن بنا دیا جاتا ہے اور کوشش کیا کرتا ہوں کہ حقائق و بصائر کی رو سے انہیں اصل حقیقت سے آگاہ کروں اور دلائل و براہین کی بنیادوں پر

ان کے شکوک وشبہات دور کروں۔ اس میں مجھے اکثر کامیابی ہوئی ہے۔ آج کی نشست میں اس خطاب سے بھی میرا مقصود یہی ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس کا عنوان بھی انہی نوجوانوں کے الفاظ سے مستعار لے لیا ہے۔

اسلام کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ اس کائنات میں خدا کے متعین کردہ، غیر متبدل، اٹل قوانین کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ عظم اس حسن وخوبی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ عام اصطلاح میں انہیں قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوانین کروڑھا کروڑ سالوں سے اسی طرح کارفرما چلے آرہے ہیں۔ نہ یہ آج تک ناکام ثابت ہوئے ہیں، نہ تھک کر کسی مقام پر رکھ گئے ہیں۔ نہ ہی ان کے نتائج واثمار میں کسی قسم کا نقص یا خلفشار رونما ہوا ہے۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط (67:3) تم تخلیق خداوندی میں کہیں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔

جس طرح خدا نے خارجی کائنات کے لیے اٹل قوانین متعین کیے ہیں، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لیے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار مقرر کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے افراد اور اقوام کو زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور انسانی معاشرہ سکون واطمینان کا گہوارہ اور عروج وارتقاء کا طیارہ بن جاتا ہے۔

انسانی دنیا:

لیکن اشیائے کائنات اور انسانی دنیا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اشیائے کائنات ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انہیں ان کی خلاف ورزی کا اختیار ہی نہیں۔ لیکن انسان کو صاحب ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اسے اس کا اختیار ہے کہ جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے ان سے سرکشی اختیار کرلے۔ جب کوئی قوم ان کے مطابق زندگی بسر کرے گی تو وہ زندگی کی خوشگواریون سے بہرہ یاب ہوگی۔ جب وہ انہیں چھوڑ دے گی تو ذلتوں اور پستیوں کے جہنم میں جا گرے گی۔ اگرچہ بات بالکل

واضح ہے لیکن میں دو ایک مثالوں سے اس کی مزید وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ایک مریض کسی ڈاکٹر سے علاج کراتا ہے اور اس کے نسخے سے اسے آرام آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اس نسخہ کا استعمال چھوڑ دیتا ہے اور پھر بیمار ہو جاتا ہے۔ فرمائیے! اس سے کیا آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ نسخہ ناکام رہ گیا یا یہ کہیں گے اس مریض نے اس نسخہ کو چھوڑ کر مرض کو پھر بلا لیا؟

یا (مثلاً) ایک شخص کسی خاص مقام تک جانے کے لیے موٹر میں سوار ہوا۔ راستے میں اس نے موٹر کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ریسٹ ہاؤس میں جا کر سو گیا اور یوں اپنی منزل مقصود پر پہنچ نہ سکا۔ کہئے! آپ اس کے متعلق یہ کہیں گے کہ اس موٹر میں اس کی صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ اگلا راستہ طے کر سکتا یا اس مسافر کی تن آسانی کا ماتم کریں گے!

یا (مثلاً) ایک شخص چھت پر جانے کے لیے سیڑھیوں پر چڑھا۔ لیکن نصف سیڑھیوں پر پہنچ کر پہلے بیٹھ گیا اور پھر نیچے اتر آیا۔ فرمائیے! آپ اس پر یہ محاکہہ کریں گے کہ اس مکان کی سیڑھیاں بڑی ناقص ہیں جو کسی کو چھت تک لے جا نہیں سکتیں، یا اس شخص کی دو ہمتی کو الزام دیں گے؟

یا (مثلاً) ہمارے ہاں بائیں چلو (Keep to the Left) ٹریفک کا قانون ہے۔ گذشتہ ماہ تک ہمارا معاشرہ اس قانون کے مطابق چلتا رہا تو ٹریفک کا کوئی حادثہ نہ ہوا۔ یکم نومبر سے ہر راہ رو یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ میں اس قانون کی پابندی نہیں کروں گا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ فرمائیے! کیا آپ اس سے یہ نتیجہ مرتب کریں گے کہ اکتوبر کے آخر تک تو اس قانون میں ٹریفک کے حادثات روکنے کی صلاحیت تھی۔ لیکن اس کے بعد اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ بالکل بیکار ہو گیا ہے! یہ اس قابل تھا ہی نہیں کہ بڑھتی ہوئی ٹریفک کا ساتھ دے سکے۔

ان مثالوں کے بعد عزیزان من! پھر اصل موضوع کی طرف آجائیے۔ اسلام نے زندگی کے کچھ اصول وقوانین دیئے۔ ایک قوم نے ان کے مطابق اپنا معاشرے متشکل کیا۔ اس سے

جو نتائج مرتب ہوئے ان کی درخشندہ اور تابناکی سے آج بھی تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ مجھے اس باب میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اس سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کرتے جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام آگے نہیں چل سکا۔ اس حد تک تو وہ بھی معترف ہیں کہ اسلام نے اس زمانے میں نہایت شاداب نتائج پیدا کیے تھے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس کے بعد اسلام میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ اس قسم کے نتائج پیدا کرتا چلا جائے۔ ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ:

(1) کیا ایسا ہوا تھا کہ وہ قوم ان قوانین پر بدستور عمل پیرا رہی، لیکن اس کے باوجود وہ ان ثمر بار نتائج سے محروم ہوگئی جن سے وہ پہلے بہرہ یاب ہوئی تھی، یا اس نے ان قوانین کا اتباع چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نتائج سے محروم ہوگئی۔

(2) اگر واقعہ یہ ہو کہ وہ قوم ان قوانین کے مطابق بدستور زندگی بسر کرتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود عروج و اقبال سے محروم ہوگئی تو پھر یہ سمجھنا درست ہوگا کہ ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ آگے چل سکتے۔ لیکن اگر واقعہ اس کے خلاف ہو، یعنی حقیقت یہ ہو کہ اس قوم نے ان قوانین کی پابندی چھوڑ دی تھی تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں اور اگر ان پر آج بھی عمل پیرا ہوا جائے تو اس سے وہی نتائج مرتب ہو سکیں جو اس زمانے میں ہوئے تھے۔ آیئے! ان سوالات پر حقیقت پسندانہ انداز سے غور کریں اور جذبات سے الگ ہٹ کر دیکھیں کہ تاریخی شواہد اور واقعات عالم کا مطالعہ ہمیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔

انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا:

پہلے ہم اس سوال کو لیتے ہیں کہ کیا اس قوم نے اسلام کے اصولوں کا اتباع بدستور جاری رکھا تھا یا انہیں چھوڑ دیا تھا؟ اس سلسلہ میں، میں اس مقام پر صرف چند ایک اصولوں کا ذکر کروں گا، اور وہ بھی اجمالاً۔ ان کا تفصیلی تذکرہ اگلے سوال کے جواب میں سامنے آئے گا۔

1۔ ملوکیت:

اسلام نے اصول یہ دیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں سے

اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ حکومت کا فریضہ، قوانین خداوندی کا نافذ کرنا ہے جن کا اطلاق مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا۔ حتیٰ کہ ان سے سربراہ مملکت بھی مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ امت کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور معاشرہ میں عزت وتکریم کا معیار، جوہر ذاتی اور سیرت وکردار کی بلندی ہوگا، نہ کہ موروثی اور خاندانی وجاہت وثروت۔ اس اصول نے ملوکیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افراد معاشرہ کو وہ حقیقی آزادی حاصل ہوگئی جس سے ان کی مضمر اور ابھر آئیں۔ اس قوم نے اپنی ہمعصر اقوام میں جو اس قدر بلند امتیازی مقام حاصل کرلیا تھا، اس کا بنیادی سبب یہی تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اسلام کے اس بنیادی اصول سے انحراف برت کر اپنے ہاں ملوکیت کا نظام قائم کرلیا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو استبداد ملوکیت کے تحت ہوا کرتا ہے۔ یعنی شرف انسانیت کی تذلیل۔

2۔ برہمنیت:

اسلام نے یہ اصول دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب ودربان نہیں۔ ہر شخص بلا کسی درمیانی واسطہ کے براہ راست قوانین خداوندی کی اطاعت کرسکتا ہے۔ اس سے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہوگیا اور یوں اس استبداد کی زنجیریں کٹ گئیں جس نے انسانیت کے قلب اور دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس آزادی سے انسان کو حریت فکر ونظر نصیب ہوئی اور وہ تمام رکاوٹیں دور ہوگئیں جو علمی تحقیق اور فکری کاوش کے راستے میں بری طرح حائل تھیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ قوم چند دنوں میں علم وبصیرت کی فضائے بسیط میں بے محابا پرواز کے قابل ہوگئی۔ اس کے بعد اس قوم نے اس اصول سے سرکشی برتی اور اپنے ہاں پھر سے برہمنیت کو رائج کرلیا۔ یہ وہ عذاب ہے جس میں یہ قوم اب تک ماخوذ چلی آرہی ہے۔

3۔ سرمایہ داری:

اسلام نے یہ اصول دیا کہ یہ چیز وجہ ذلت انسانیت ہے کہ کوئی شخص روٹی کے لیے کسی دوسرے شخص کا محتاج ہو۔ نظام مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات

زندگی کی ذمہ داری لے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہوگا کہ ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کی بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں اور فاضلہ دولت کسی شخص کے پاس نہ رہے۔ اس سے جہاں تک تمام افراد قوم رزق کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گئے، وہاں معاشرہ ہوس زراندوزی کی لعنت سے بھی پاک ہو گیا۔ اس قسم کے نظام میں عروج وارتقاء کی راہیں جس برق رفتاری سے کشادہ ہو جاتی ہیں، اس کی شہادت تاریخ کے اوراق سے مل سکتی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب اس قوم نے ملوکیت کو اپنے ہاں پھر سے رائج کر لیا۔ تو نظام سرمایہ داری کی لعنت بھی ساتھ ہی آ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری، ایک ہی شجرۃ الزقوم کے برگ وبار ہیں۔ جب یہ قوم اسلامی اصولوں پر کاربند تھی تو حالت یہ تھی کہ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ (عمر فاروقؓ) کے تہبند پر دس، دس، بارہ، بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ لیکن جب ان میں ملوکیت بار پا گئی تو کیفیت یہ تھی کہ اموی خلیفہ، ہشام بن عبدالملک جب (سیر وتفریح کے لیے نہیں) حج کے لیے چلا ہے تو چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے پہننے کے کپڑے لدے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہوگی کہ اس قوم نے اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا تھا یا باقی رکھا تھا!

4: تکریم انسانیت:

اسلام نے یہ اصول دیا تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان، صرف انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس ایک اصول نے نسلی اور خاندانی تفاوت وامتیازات کی ساری عمارت منہدم کر کے رکھ دی اور وہ خطہ ارض، مساوات انسانیہ کے نور سے جگمگا اٹھا۔ اس معاشرہ میں حبش کا ایک غلام (بلالؓ) سرداران قریش سے زیادہ واجب التعظیم قرار پا گیا کہ سیرت وکردار کی رو سے وہ ان سے ممتاز تھا۔ اور امیر المومنین (حضرت عمرؓ) کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لیے روم کے ایک مزدور (صہیبؓ) کو منتخب کیا گیا۔

نسلی امتیازات اور گروہ بندانہ تفریقات کے مٹنے کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ امت میں وحدت پیدا ہو گئی۔ یہ وہی چٹان تھی جس سے ٹکرا کر مخالفت کی ہر قوت پاش پاش ہو جاتی تھی۔ کچھ عرصہ

بعد انہوں نے پھر نسلی امتیازات کو بیدار کرلیا جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خلافت راشدہ تک تو سلطنت امت مسلمہ کی تھی۔ لیکن اس کے بعد مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ امت کی حکومت کہیں قائم نہیں ہوئی۔ یہ حکومتیں بنوامیہ، بنوعباس، بنوفاطمہ کی تھیں۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

5۔ غلامی:

تکریم انسانیت کا فطری نتیجہ غلامی کا ختم کر دینا ہے۔ ظہور اسلام کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عرب معاشرہ میں موجود تھے، قرآن نے انہیں رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنا دیا اور آئندہ کے لیے اس لعنت کو ختم کر دیا۔ معاشرہ میں جذب کردہ غلاموں کو مقام کیا دیا گیا تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب حضرت عمرؓ سے، ان کی شہادت کے وقت کہا گیا کہ اپنے جانشین کے بارے میں آپ اپنی رائے دے دیں تو آپ نے کہا کہ اگر ابی حذیفہؓ کا آزاد کردہ غلام، سالمؓ موجود ہوتا تو میں خلافت کے لیے اس کا نام تجویز کرتا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد، اس قوم نے شرف انسانیت کے اس اصول کو ترک کر دیا اور اپنے ہاں غلامی کو پھر رائج کرلیا۔ نتیجہ یہ کہ خلفاء کے حرموں میں ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں ہوتی تھیں اور بغداد میں ان کی خرید وفروخت کے لیے ایک بازار مخصوص تھا۔ جہاں حکومت کی زیر نگرانی انسانیت بکتی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بتانے کے لیے کہ اس قوم نے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ کر پھر سابقہ روش اختیار کر لی تھی۔ اتنی مثالیں ہی کافی ہوں گی۔ بنا بریں، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام نے کچھ وقت کے لیے خوشگوار نتائج مرتب کئے تھے لیکن اس کے بعد اس میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں رہ تھی۔

کیا اسلام میں اب بھی اس کی صلاحیت ہے؟

اس کے بعد عزیزان من! ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا اسلام میں اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت ہے؟ اور اس سوال کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ ''اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت'' تو ایک طرف، اس چودہ سو سال میں دنیا میں چلا ہی اسلام ہے۔ کوئی دوسرا نظام چلنے

کے قابل ثابت ہی نہیں ہوا۔ میرا یہ جواب بڑا تعجب انگیز نظر آئے گا لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے، محض جذباتی نعرہ نہیں۔ اس کے لیے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو ابدی اصول اور مستقل اقدار، انسانی راہ نمائی کے لیے منجانب اللہ عطا ہوئے ہیں، ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ، راستے کے موانعات کو ہٹاتے ہوئے، آگے بڑھیں اور اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ سورۃ فاطر میں ہے: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (35:10) ان۔ نظریات حیات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اوپر کو ابھرتے ہوئے، عروج وارتقا کی اس منزل تک پہنچ جائیں جسے ان کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ ان نظریات کو قرآن نے الحق کہہ کر پکارا ہے اور ان موانعات کو جو ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ باطل سے تعبیر کرتا ہے اور اس کشمکش حق و باطل کے متعلق کہتا ہے کہ: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ (21:18) الحق، باطل پر اپنا نشانہ لگاتا رہتا ہے تا آنکہ باطل کا بھیجا نکل جاتا ہے۔ اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کہتا ہے کہ اس طرح باطل کی شکست اور حق کی فتح۔۔۔ یا یوں کہئے کہ ان نظریات حیات کے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔

کائناتی رفتار:

يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (32:5) ان کی اس رفتار کا ایک ایک دن، تمہارے حساب وشمار کی رو سے ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اگر آپ ان نظریات کو اپنی زندگی میں عملاً رائج کر لیں۔ تو پھر ان کے نتائج، انسانی حساب وشمار کے مطابق دنوں میں مرتب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جہاں اس نے کہا ہے کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (35:10) (ان نظریات میں از خود ابھرنے کی صلاحیت موجود ہے) اس کے بعد کہا ہے کہ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (35:10) انسانی اعمال صالح کی قوت انہیں نہایت تیزی سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

عقل کا تجرباتی طریق:

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان اپنی عقل وفکر اور تجربہ ومشاہدہ کی رو سے مسائل حیات کے حل کرنے کی کوشش میں لگا چلا آرہا ہے۔ غاروں کے زمانے سے لے کر اس دور تہذیب وتمدن تک کی تاریخ اس کی انہی کوششوں کی مسلسل داستان ہے۔لیکن یہ ظاہر ہے کہ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ (Trial and error) کے طریق سے معاملات کو سمجھتی اور سلجھاتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ سینکڑوں برس کی لامتناہی خارہ شگافیوں کے بعد، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر پھر کوئی اور نظریہ وضع کرتی ہے اور اسی طریق پر، اس کا تجربہ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح صدیوں کے پیہم ناکام تجارب کے بعد، وہ کسی صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔ عقل کے اس تجرباتی طریق کی رو سے، ایک صحیح نظریہ تک پہنچنے کے لیے جہاں انسان کو ہزاروں سال کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ وہاں آگ خون کی سینکڑون خندقیں بھی پھاندنی پڑتی ہیں۔ اس کے برعکس وحی خداوندی انسان کو پہلے دن ہی صحیح نظریات حیات عطا کر دیتی ہے۔ ان نظریات کی صداقت کو (علی وجہ البصیرت) تسلیم کر کے، ان کے مطابق عمل پیرا ہو جانے والی جماعت، ان راستوں کو، جنہیں تنہا عقل انسانی نے قرن باقرن میں بے کیا تھا، اور وہ بھی اس قدر جانکاہ مشقتوں کے بعد، چند دنوں میں، نہایت امن وسکون کے ساتھ، طے کر جاتی ہے۔ اس طرح ان نظریات کے وہ نتائج، جو عقل کے تجرباتی طریق کی رو سے، ہزار ہا سال میں جا کر برآمد ہونے تھے، چند دنوں میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی علم وعقل بھی، رفتہ رفتہ، ان صحیح نظریات تک پہنچ جاتی ہے جنہیں وحی نے عطا کیا تھا۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ عقل کی راہیں بڑی طول طویل اور پر از خطرات وصعوبات ہوتی ہیں اور وحی کی روشنی میں یہ راستہ طرفۃ العین میں طے ہو جاتا ہے اور نہایت امن وسلامتی کے ساتھ۔۔۔ افلاطون (Plato) نے ہزاروں سال پہلے اس حقیقت کو پالیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ:

یہ (ارباب فکر) کچھ بنائیں گے۔ اسے پھر مٹائیں گے۔ یہی کچھ کرتے رہیں

گے۔تا آنکہ وہ انسانی راستوں کو حتیٰ الامکان، خدائی راستوں سے ہم آہنگ کرلیں گے۔(Republlc)اقبالؔ نے اسی حقیقت کو اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ:

ہر دو امیر کارواں، ہر دو بمنزلے رواں
عقل بہ حیلہ می برو، عشق برد کشاں کشاں

صدر اوّل میں اسلام:

اس تمہید وضاحت کے بعد، اصل موضوع کی طرف آیئے۔انسان، تنہا عقل کی رو سے، زندگی کے طول طویل راستوں پر گامزن چلا آرہا تھا۔ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا، ٹھوکریں کھاتا، ہڈیاں تڑواتا۔۔کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، قندیل وحی نے ان راستوں کو یک دم روشن کردیا۔عرب میں بسنے والی قوم نے اس کے عطا کردہ نظریات حیات کو اپنایا او ربرق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔اس کے بعد اس قوم نے وحی کی راہ نمائی کو چھوڑ دیا، اور کاروان انسانیت پھر عقل کے تجرباتی طریق سے شاہراہ حیات پر گامزن ہوگیا۔اب اس کی رفتار پھر سست ہوگئی۔انسانیت پھر عقل کے تجرباتی طریق سے شاہراہ حیات پر گامزن ہوگئی۔اب اس کی رفتار پھر سست ہوگئی۔رفتار تو بے شک سست ہوگئی لیکن اس کا ہر قدم اٹھتا اسی منزل کی طرف جارہا ہے جس طرف اسے وحی کی روشنی لے جارہی تھی۔ چنانچہ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان آج سے چودہ سو سال پہلے، جن غلط نظریات کو سینے سے لگائے ہوئے تھا اب رفتہ رفتہ انہیں چھوڑتا جارہا ہے اور ان نظریات کی طرف آرہا ہے جنہیں قرآن نے عطا کیا تھا۔ یہ ہے مطلب میرے اس کہنے کا کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں اسلام ہی آگے چلا ہے۔اسلام کے خلاف نظریات سب ناکام ثابت ہوتے چلے جارہے ہیں۔ آیئے، اس کی چند ایک مثالیں سامنے لائیں۔

حق حکومت:

چھٹی صدی عیسوی میں، ساری دنیا میں انداز حکومت ملوکیت تھا۔جس کی رو سے، راجہ کو ایشور کا اوتار، قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل، اور کسری کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔عین

اس ماحول میں قرآن نے آکر کہا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطہ قوانین، حق حکومت اور نبوّت بھی کیوں نہ مل گئی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میری محکوم بن جاؤ۔ اس ایک اصول کی رو سے قرآن نے، ملوکیت تو ایک طرف، حکومت کی کوئی ایسی شکل باقی نہ رہنے دی جس میں انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اب رہا یہ کہ پھر حکومت ہو کس طرح سے؟ اس نے کہا کہ حکومت انسانوں کی نہیں ہوگی بلکہ ان مستقل اقدار اور اصولوں کی ہوگی جو خدا کی طرف سے عطا کیے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، امت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے اپنے معاملات طے کرے گی۔ (42:38) اس میں مذہبی پیشوائیت کا بھی کوئی دخل نہیں ہوگا اس لیے یہ نظام تھیاکریٹک بھی نہیں ہوگا۔ اس اصول کے مطابق مسلمانوں نے نظام حکومت قائم کیا جس کے انسانیت ساز نتائج وجہ شادابی عالم بن گئے۔ اس کے بعد، اس قوم نے اس اصول کو چھوڑ دیا، اور انسان پھر تنہا عقل کی رو سے، ایک اطمینان بخش نظام حکومت کی تلاش میں چل نکلا۔ اب آپ دیکھئے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں انسان کا قدم ملوکیت کی طرف اٹھا ہے، یا یہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا، کسی ایسے نظام کی تلاش کرتا رہا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ وہ اپنی اس تلاش میں ہزاروں خوں ریزیوں اور فساد انگیزیوں کے بعد، اس نظام تک پہنچ پایا ہے جسے جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مغرب کا جمہوری نظام:

ملوکیت کے مقابلہ میں جمہوری نظام، اسلام سے زیادہ قریب ہے۔ دنیا نظام جمہوریت سے بھی مطمئن نہیں۔ خود مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور سیاستدان اس نظام کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ (مثلاً) فرانسیسی مفکر (Rene guenn) لکھتا ہے۔

> ''اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کرلیں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے۔ جو نہ پہلے کبھی وجود میں آئی

ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی نا قابل یقین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی۔۔۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔''

(Crisis of the modern world)

اقبالؒ کے الفاظ ہیں ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری؟

''اکثریت کے فیصلوں'' کے متعلق ایک اور مفکر، پروفیسر الفریڈ کوبن لکھتا ہے کہ (یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے) اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔

(The crisis of civilisation)

پروفیسر کوبن نے کہا ہے کہ ''فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔'' سوال یہ ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ

معیار، وہ مستقل اقدار ہیں جو وحی کی رو سے عطا ہوتی ہیں۔ دیکھئے اس باب میں اٹلی کا مشہور مدبر، میزینی کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت قائم رکھی سکتی ہے لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدت عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کرسکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسانوں کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ انسان (جمہوریت)۔ بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کلے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقت ور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور نا قابل تغیر قانون نہ ہو جو انسان کا وضع کردہ نہ ہو۔ تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو، اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ حکومت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھیئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج وتنفیذ کے لیے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا حق ہی نہیں فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔ (Cf griffith - Interpretters man)

ہم سمجھتے ہیں کہ میزینی نے بات دوٹوک الفاظ میں بیان کردی ہے۔ عصر حاضر کی ساری کشمکش یہی ہے۔ میکیاوَلی اصول سیاست، جس کے سب سے بڑے علمبردار، مارکسی فلسفہ کے مدعی ہیں، یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار کوئی نہیں۔ انسان اپنے

معاملات کے فیصلے آپ کرنے میں اختیار مطلق رکھتا ہے۔ اس کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ اس کے برعکس، اسلام نے یہ کہا تھا کہ اگر انسان امن وسلامتی سے ترقی کی راہیں طے کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ اپنے فیصلوں کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار مستقل اقدار کو قرار دے۔ میزینی نے یہی کہا ہے۔ دیکھئے کہ اس بات میں دیگر مفکرین کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر (Brend) عصر حاضر کی بے لگام سیاست کے متعلق لکھتا ہے۔

''انسان کی کوئی جماعت ہو، ایک فرد کو، ایک محدود حلقہ کے اندر اور خاص شرائط کے ماتحت ہی جذبات کی آزادی دی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنے جذبات کو، اس محدود حلقہ سے باہر اور ان مخصوص شرائط کو توڑ کر بروئے کار لانے کی کوشش کرے تو وہ جماعت اس کی روک تھام کی تدبیر کرتی ہے۔ لیکن آج کوئی ایسا اقتدار اعلیٰ نہیں جو اقوام پر بھی اسی قسم کی پابندی عائد کرسکے۔ اس لیے اقوام کو اپنے جذبات کو بے زمام چھوڑنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ آج اقوام عالم کی حالت بالکل عہد طفولیت کی سی ہے جس میں بچہ ہر اس پابندی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے جذبات کے راستے میں حائل ہو۔''

(Foundations of Human confilct)

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہاں دین سے مراد یہی مستقل اقدار خداوندی ہیں، نہ کہ مذہبی پیشوائیت کے وضع کردہ رسوم وعقائد۔

جس زمانے میں متحدہ اقوام کو ''حقوق انسانیت کا منشور'' زیر تدوین تھا، اس کے ادارہ (Unesco) نے اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کرکے دنیا بھر کے مفکرین اور سیاستدانوں کے پاس بھیجا۔ اس ادارہ نے بعد میں، ان مشاہیر کے جوابات کو ایک مجموعہ کی شکل

میں شائع کیا تھا جس کا تعارف(Jacques Maritain) نے لکھا تھا۔اس نے اس تعارف میں کہا تھا کہ:

انسان کے حقوق کو(Definition) کی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔حقوق انسانیت کے احترام کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔اسے فلسفہ زندگی کہا جاتا ہے۔

''فلسفہ زندگی''، مستقل اقدار کا دوسرا نام ہے۔اسی کو اخلاقیات کہا جاتا ہے اور اخلاقیات کے متعلق راشڈل لکھتا ہے کہ:

ان سے مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لیے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لیے یکساں ہے۔

(The theory of good and evil- VI:II)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ:

مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔مستقل اقدار کو عالمگیر ہونا چاہئے۔جسے ہر شخص تسلیم کرے اور ان کو معترف ہو۔

(Between Man and Man)

یہ اقدار ملتی کہاں سے ہیں، اس کے متعلق غور سے سنئے، اور سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اس کا کہنے والا کوئی ملّا یا پادری نہیں۔ کہنے والا عصر حاضر کا سب سے بڑا سائنٹسٹ آئن سٹائن ہے۔وہ کہتا ہے۔

یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاسکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ان کی بنیاد عقل انسانی پر نہیں ہوتی۔لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔اس لیے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔(out of my later days)

جس نظام میں ان اقدار کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کا حشر کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق اس عالمگیر شہرت کے حامل دانشور کی زبان سے سنئے جس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ یعنی (The making of humanity) کا مصنف برفا۔ وہ لکھتا ہے۔

> انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم وضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے، اس کے لیے تباہی مقدر ہے۔

یہی مفکر آگے چل کر لکھتا ہے۔

> وہ نظام تہذیب جس میں حق وصداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو، آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی شخص کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے، اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار تباہ ہو جاتی ہے۔

عدل کا مفہوم:

برفا نے یہاں کسی نظام کی کامیابی کے لیے عدل کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ عدل کا عمومی مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ ملک کے مروجہ قانون کے مطابق ہو وہ عدل کہلائے گا۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے کو عدل کہا جائے گا۔ لیکن جس قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے اگر وہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ اس لئے اس نے کہا کہ ملک کے قوانین کو الحق کے مطابق ہونا چاہئے۔ یعنی مستقل اقدار خداوندی کے مطابق۔ (7/181) تاکہ جو فیصلے اس قانون کے مطابق کیے جائیں وہ فی الواقعہ مبنی بر عدل کہلا سکیں۔ دیکھئے اس باب میں دور حاضر کا ایک مشہور فلسفہ قانون کا ماہر (Email Brunner) کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (Justice and the social order) میں لکھتا ہے۔

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم ورواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لیے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور طمع سازی ہوگی۔

عزیزان من! میں نے کہا تھا کہ قرآن کریم نے اصول یہ دیا تھا۔

(1) کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس لئے ملوکیت، آمریت وغیرہ سب نظام ہائے حکومت باطل ہیں۔ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہیں۔

(2) لیکن اس مشاورت میں ایک شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا اور وہ یہ کہ کوئی فیصلہ ان اقدار کے خلاف نہ ہو جو حق مطلق کی حیثیت رکھتی ہیں اور وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔

(3) اس کے بعد، عقل کے تجرباتی طریق نے انسان کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ملوکیت، آمریت وغیرہ نظام غلط ہیں ان کے برعکس، نظام مشاورت صحیح نظام ہے جسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اس حد تک دنیا میں اسلام کا پیش کردہ اصول آگے چلا ہے یا وہ اصول جو پیچھے سے چلا آرہا تھا اور اسلام نے اسے باطل ٹھہرایا تھا؟

لیکن ہمارے زمانہ تک عقل انسانی ہنوز اسلامی اصول کے ایک حصہ کو اپنا سکی ہے۔ یعنی ملوکیت کی جگہ نہیں پہنچ سکی؟ بایں ہمہ، اسلامی اصول کے اس حصہ کی صداقت اور اہمیت دور حاضر کے مفکرین کی نگاہوں کے سامنے آرہی ہے اور وہ اس پر زور دے رہے ہیں کہ اسے بھی اپنایا

جائے۔ وہ دن دور نہیں جب انسان اس اصول کو اپنانے پر بھی مجبور ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس نظام زندگی کے حیات سوز اور تباہ کن اثرات جسے عصر حاضر نے مستقل اقدار کو نظر انداز کر کے تعمیر کیا، اس قدر نمایاں طور پر سامنے آ رہے ہیں کہ خود وہ قومیں جنہوں نے اس نظام کو متشکل کیا تھا، ان کی وحشت سامانیوں کو دیکھ کر چیخ اٹھی ہیں۔ اس چیخ و پکار کی تفصیل میں جانے کے لیے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔ میں اس مقام پر دو ایک اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے لارڈ اسنل (Snell) نے (The new world) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ اس میں کہتا ہے۔

نوع انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ اسے برباد بلکہ فنا کر دے گا۔ یوں تو انسان کی طول طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سے وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ جنگ ہوتی تھی تو کسی ایک مقصد کے لیے۔۔ وہ لڑائیاں خاندانی وجاہت اور مادی تفوق کے لیے ہوتی تھیں۔ لیکن گذشتہ جنگ (یعنی دوسری جنگ عظیم) کو دیکھئے۔ اس کی ظلمت انسانی قلب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی۔ نسلی افتخار، جذبات تغلب وتسلط اور مملکت کے متعلق غلط فلسفہ۔۔ لہٰذا جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کبھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانے پر افلاس امراض اور اموات کے شیاطین منڈلا رہے ہیں۔۔۔ انسانیت اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔ یہ مصیبتیں نتیجہ ہیں ان میکانکی قوتوں کا جنہیں انسان نے ایجاد تو کر دیا۔ لیکن ان پر قابو پانا نہ سیکھا ہر جگہ ریب وشکوک اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس، انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے

ہے۔ زندگی اس بیم ورجا، فتح وشکست، امید ویاس کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ اگر ہم نے اپنی ناتواں زندگیوں کی شکستہ عمارت کو از سرنو محکم بنیادوں پر ستوار نہ کیا تو ہماری تقدیر بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔

حکیم مشرق نے اس سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ:

خبر ملی ہے خدایان بحر وبر سے مجھے
فرنگ رہگذر سیل بے پناہ میں ہے

یہ تو ہے عصر حاضر کی اقدار فراموش دنیا کی اجتماعی زندگی کا نقشہ، جہاں تک افراد کا تعلق ہے، علم تحلیل نفسی کے عظیم محقق ڈاکٹر ینگ نے آج سے بہت پہلے لکھا تھا کہ:

عصر حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں ان وحشیانہ قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے، جہاں تعمیر وتخریب کی قوتیں ہر وقت ترازو کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

(Modern man in search of soul)

عصر حاضر کے راہ گم کردہ انسان کی یہی وہ قلبی کیفیت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو ناکام کہنے والوں سے کہ اقوام دور حاضر کی یہ چیخ وپکار،

اسلامی نظام زندگی کی طرف دعوت دے رہی ہے یا اس سے دور بھاگنے کی تلقین کر رہی؟

نظریہ قومیّت:

اب ایک اور سوال سامنے لایئے۔ انسان نے جب مل جل کر رہنے کی زندگی شروع کی تو اسے لامحالہ کسی ایسی بنیاد کی تلاش ہوئی جس سے افراد مل کر ایک جتھ بن سکیں۔ اس دور میں یہ بنیاد خون کے رشتوں کے سوا اور کونسی ہوسکتی تھی۔ اس سے ایک خاندان کے افراد مل کر ایک جتھ بن گئے۔ انہیں خاندانوں نے وسعت اختیار کر کے قبائل کی شکل اختیار کر لی اور قبائل وسیع تر ہوکر، نسلی امتیازات کے حلقے بن گئے۔ نزول قرآن کے زمانے میں یہی امتیاز قومیت کا معیار تھا۔ اسلامی نے یہ انقلابی آواز اٹھائی کہ قومیت کا یہ معیار غلط ہے۔ اس وقت بھی اس کے نتائج بڑے خطرناک مرتب ہو رہے ہیں لیکن جب انسانی آبادی اور بڑھی اور وسائل رسل ورسائل اور ذرائع مواصلات عام ہوئے تو قوموں کا باہمی تصادم خود نوع انسانی کو تباہ کر دے گا۔ اس نے کہا کہ قومیت کا معیار، خون، رنگ، نسل، زبان کے اشتراک کے بجائے، فکر ونظر کی ہم آہنگی ہونا چاہیئے۔ اسی کو آئیڈیالوجی یا ایمان کا اشتراک کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اس اشتراک کو کسی خاص خطہ زمین تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔

لیکن عقل انسانی کا تجرباتی عمل ابھی یہیں تک پہنچ سکا ہے۔ اس نے ہنوز انسان کو وطن کی تنگ نائے سے نہیں نکالا۔ یعنی اب انسانوں کی تفریق اور قوموں کی تقسیم وطن کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے وضع کردہ اس نظریہ کے نتائج سے مطمئن ہے یا اس کے ہاتھوں نالاں ہے؟ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، خود اس نظریہ پر عمل پیرا اقوام مغرب کی زبانی سنئے۔ پروفیسر الفریڈ کوبن جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس باب میں لکھتا ہے۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان قوموں کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی

ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حق استقلال و خود مختاری کو مسلط کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لیے خود مختاری کی مدعی ہوں۔ ان وجوہات کی بنا پر لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظام حکومت کے لئے نیشنلزم کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔

پروفیسر کوبن اپنی کتاب (Creative Freedom) میں لکھتا ہے کہ جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے۔ جس طرح افراد میں باہمی تنازع کی بنیاد جذبہ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

پروفیسر ولیم برنڈ نے دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ:

اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوام یورپ چند سال تک عملی نبرد آزمائی میں نہیں الجھیں گی کیوں کہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے۔ لیکن نیشنلزم کا وہ جذبہ جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے باقی رہے گا۔ اس لئے مستقبل میں جنگ کو ختم کرنے کے لئے، آج کی سیاستدانی کی پرکھ اسی سے ہوگی کہ موجودہ جنگ کے بعد نیشنلزم کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔

(Foundation of human conflict.)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (The hopes for a changing world) میں لکھتا ہے:

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے۔ وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ (پھر تماشہ یہ کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ یورپ نے نیشنلزم کو محض ایک سیاسی مسلک کی حیثیت سے ہی

اختیار نہیں کیا بلکہ اسے مذہب کی پوزیشن دے رکھی ہے۔ وہاں وطن کو ایک دیوتا سمجھا جاتا ہے جس کی پرستش ہوتی ہے۔ آلڈوس بکسلے اس باب میں بڑی وضاحت سے لکھتا ہے اور بہ تکرار واصرار لکھتا ہے کہ:

نیشنلزم ایک بت پرستانہ، مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ وہ مذہب جو فساد وتفریق انسانیت کے لئے ایسا طاقتور کہ کوئی خدا پرست مذہب، فلاح اور وحدت انسانیت کے لئے، اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

نیشنلزم، جسے ہم نے ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوام عالم کہا جاتا ہے۔ یہ ان میں سے ہر قوم کا ''مملکتی مذہب'' ہے۔ یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پچاس دیوتاؤں میں سے، ہر ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملیکشی تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترام آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پاجاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہوجاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں اس کا وجوب ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے۔

ضمناً ھکسلے نے، نیشنلزم کو آج ایک ''باطل خدا'' کہا ہے۔ اقبالؒ نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کہا تھا کہ:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف وستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور اس کا نتیجہ یہ بتایا تھا کہ:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اور اس کے بعد مسلمانوں سے تاکید کی تھی کہ:

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملادے

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس نیشنلزم کے ہاتھوں جسے اسلام نے فساد آدمیت کی بنیاد قرار دیا تھا، خود اقوام مغرب کے مفکر اور سیاستدان اس قدر گریاں و نالاں ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو چلا ہوا کارتوس کہنے والوں سے کہ اقوام یورپ کا یہ واویلا، اسلامی اصول قومیت کی صداقت کی شہادت ہے یا اس کے ناکارہ ہونے کی دلیل۔

یہ اس مسئلہ کا منفیانہ پہلو تھا۔ یعنی نیشنلزم کی تباہ کاریوں کے خلاف اقوام مغرب کا نالہ وشیون۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اس فساد کا علاج کیا ہے؟ پروفیسر برنڈ نے کہا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم قومیت کی جگہ بین الاقوامیت (انٹرنیشنلزم) کو فروغ دیں۔ اس کے خلاف مسٹر (Emeryreves) نے کہا کہ:

ہم انٹرنیشنلزم سے بھی کافی کھیل چکے ہیں۔ (اقوام متحدہ کی ناکامی اس کا بین ثبوت

ہے) جو مسئلہ دنیا کے سامنے ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے اس کا حل دریافت کردے؟ اس کا حل انسانیت کی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔

(The anatomy of peace)

کیتھولک چرچ کا راندہ درگاہ اسقف (Tellard-df-chardin) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب (Bullding of the Earth) میں لکھتا ہے۔

اب اقوام کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصّبات کو ختم کردیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرہ ارض کی تعمیر نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوت انسانیت کا راستہ۔ اب شعور انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوع انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (Hugh Miller) اپنی کتاب میں جس کا نام ہی اس نے (The community of man) رکھا ہے لکھتا ہے۔

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی۔ لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جاسکتا ہے جو انسانوں کو باہم گرجوڑ دے انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہئے جو تمام نوع انسان پر مشتمل ہو۔

جی نہیں چاہتا کہ میں یہ کہے بغیر آگے بڑھ جاؤں کہ جو کچھ اس مفکر نے کہا ہے وہ گویا قرآنی آیات کا ترجمہ ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ (10:19) نوع انسان شروع میں ایک ہی برادری تھی۔ لیکن اس کے بعد اس نے باہمی اختلاف پیدا کرلیا اور مختلف خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ اس میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کے لئے خدا کی طرف سے راہنمائی ملی۔ (2:213) اس نے کہا ہے کہ انسانیت کی بارگاہ میں سب سے بڑے مجرم وہ ہیں جو وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ (2:27) جس بکھری ہوئی انسانیت کو جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور اس طرح دنیا میں فساد برپا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

عزیزان من! آپ قرآن کریم کی ان آیات جلیلہ پر غور کیجئے اور پھر پروفیسر ملر کے مذکورہ بالا اقتباس کو دیکھئے اور پھر بتایئے کہ کیا وہ انہی آیات کا ترجمہ نہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ اپنے غلط نظریات کا ستایا ہوا انسان آخرالامر کس آستانہ پر پہنچ کر پکارتا ہے کہ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم خانہ خراب کو، ترے عفو بندہ نواز میں

انسان جس عالمگیر انسانی برادری کی تلاش میں ہے، اس کی تشکیل کا طریق کیا ہوگا۔ اس کے متعلق سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات (GUNNER MYRDAL) لکھتا ہے:

> ''یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہوسکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے۔ جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں۔ اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کرسکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار

سرانجام دے گی۔''

اور اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے کہ:

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس کا کمال ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

(Beyond the welfare state)

اس ''مذہب'' کے متعلق جو (Myrda) کی روح کے نشیمن میں جلوہ بار ہے، ایک اور ممتاز مفکر (Eric Fromm) لکھتا ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو:

انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیم کا نشیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابل عمل ضابطہ اخلاق دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوع انسان کا مذہب بن سکے۔

(The sane society)

وقت نہیں، ورنہ میں، عزیزان گرامی قدر بتاتا کہ قرآن کریم کس طرح اس دین کی یہی خوصیات بتاتا ہے جسے اس نے عالمگیر انسانیت کے لئے بطور ضابطہ حیات تجویز کیا ہے۔ اس مفکر نے کہا ہے کہ زمانے کے تقاضوں کی رو سے اس مذہب کی نمود ہوگی اور قرآن کریم نے یہی طریق اپنے مستور حقائق کی نمود کے لئے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (41:53) (جوں جوں علم انسانی ترقی کرے گا اور انسانی تقاضے بڑھیں گے) عالم انفس و آفاق کے مستور حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے

اور جوں جوں یہ حقائق بے نقاب ہوں گے۔ یہ حقیقت سامنے آتی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے کہا تھا وہ صداقت پر مبنی تھا۔

یہ مذہب اسلام ہی ہوسکتا ہے:

اب رہا یہ سوال کہ دنیا کو جس عالمگیر مذہب انسانیت کی تلاش ہے کیا وہ اسلام کے سوا کوئی اور بھی ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں۔ ایک غیر مسلم کی زبان سے سنئے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ غیر مسلم کون ہے اور کس پایہ کا مفکر ہے۔ یہ عصر حاضر کا سب سے بڑا مورخ، پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی ہے۔ وہ اپنی کتاب The world and the west میں لکھتا ہے۔ اور دیکھئے کہ وہ ایسا لکھتے وقت ہمارے منہ پر کتنے زور سے طمانچہ مارتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعث فوز وفلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دیگر اسلامی ممالک نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے جارہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہئے کہ جن مسلمانوں کا مذہب عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان بلالحاظ اختلافِ نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں، ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہوگیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ آج جب کہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں'' فاصلہ'' کا تصور آہستہ آہستہ مٹتا جارہا ہے۔ مسلمانوں کا اخوت باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے، برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں محض قومیت کے معیار پر، درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے جن میں سے ہر ایک، دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہوچکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم وبیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں

ہوسکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا کہ وہ اس کے تصوراتِ حیات کو آنکھیں بند کئے اپنائے چلے جارہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودت واخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصور اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصور، ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہوگئی ہے۔''

پروفیسر ٹوئن بی کے نزدیک، دنیا میں عالمگیر برادری متشکل کرنے کا واحد ذریعہ اسلامی نظریہ اجتماعیت ہے اور اسے یہ غم کھائے جارہا ہے کہ اگر یہ نظریہ بھی باقی نہ رہا تو دنیا کا کیا حشر ہوگا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے ہاں کی فریب خوردہ ذہنیتوں سے کہ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے، یا دنیا اسے اپنی نجات کے لئے آخری سہارا قرار دے رہی ہے! اور پھر میں پوچھنا چاہتا ہوں قومیت زدہ مسلمانوں سے کہ وہ سوچیں کہ دنیا ان کے ساتھ کیا توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے، اور وہ کس طرف جارہے ہیں؟ غالب نے کسی ایسے ہی حسرت آمیز منظر سے متاثر ہوکر کہا تھا کہ ؎

تماشہ کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

نظام سرمایہ داری:

اب میں عزیزان! انسانی زندگی کے ایک اور اہم گوشے کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ گوشہ ہے جس نے عصر حاضر میں خاص طور پر بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی معاشی نظام کا مسئلہ۔ انسانی زندگی کا مدار، زمین کی پیداوار پر ہے۔ جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی اس نے دیکھا کہ اس ذریعہ زیست پر بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا قبضہ چلا آرہا ہے اور وہ اپنی مقبوضہ زمین پر مزارعوں ہی سے نہیں، غلاموں سے کام کراتے ہیں۔ قرآن نے آکر

یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ نہ ذرائع پیداوار پر افراد کی ملکیت ہوسکتی ہے، نہ کسی انسان کے پاس اس کی ضروریات سے زاید (فاضلہ) دولت رہ سکتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو غلامی کا خاتمہ ہوگیا۔ اور دوسری طرف نظام سرمایہ داری کی بساط الٹ گئی اور قرآن کی حامل قوم نے ایسا معاشرہ متشکل کر کے دکھادیا جس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی سے محروم تھا اور نہ ہی کوئی تن آسان دولت پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا۔ اس طرح دنیا کو بتادیا گیا کہ یہ نظام ممکن العمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ مسلمانوں نے کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کو ختم کر دیا اور قرآنی اصول پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے بڑھنے لگے۔

آپ سوچئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسان کے قدم نظام سرمایہ داری کی طرف اٹھے ہیں یا اس نظام معیشت کی طرف، جسے قرآن نے وجہ حریتِ انسانیت قرار دیا تھا آج اس باب میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آج اس نظام کا غلغلہ ساری دنیا میں بلند ہورہا ہے۔ کیا یہ اس امر کی زندہ شہادت نہیں کہ اسلامی نظام معیشت ہی آگے چلا ہے اور اسی میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے حیات بخش نظام بن سکے؟ لیکن عقل کا تجرباتی طریق ابھی اس نظام کے مادی پیکر تک پہنچ سکا ہے۔ اس کی روح تک ہنوز اس کی رسائی نہیں پاسکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ نظام اوّل تو اپنی پہلی منزل ___ یعنی سوشلزم ___ میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہے۔ آخری منزل ___ کمیونزم ___ تک پہنچ ہی نہیں پایا۔ اور دوسرے، سوشلزم، بھی ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے جھکڑوں کے زور سے فضائے عالم پر چھا جانے کی کوشش میں مصروف ہے قلب و دماغ کے اطمینان سے زندگی کی بنیاد نہیں بن رہا۔ یہ اس لئے کہ اس قسم کے معاشی نظام کی بنیاد جس تصورِ حیات پر استوار ہوسکتی ہے وہ اس کی نگاہوں سے ہنوز اوجھل ہے۔ وہ بنیاد ہے مکافاتِ عمل اور حیات آخرت پر ایمان ___ وہ ایمان، جس کی بنا پر اس ذمہ داری کو قبول کرنے والے (عمرؓ فاروق) نے کہا تھا کہ:

''اگر (انسان تو ایک طرف) دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم، عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔''

''باز پرس'' کا اس قسم کا احساس، صرف حیاتِ آخرت کے ایمان سے پیدا ہوتا ہے، اور جب تک یہ احساس بیدار نہ ہو، یہ معاشی نظام کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ گوئٹے نے کس قدر بلیغ انداز میں کہا ہے کہ تسلسل حیات کے بغیر تو اس دنیا کی زندگی بھی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ میں کیوں نہ اس کے اپنے الفاظ (Quote) کر دوں۔ اس نے کہا ہے کہ:

That man is dead even in this life who has no belif in another.

سوشلزم، عقل کے تجرباتی طریق کا قدم اوّل ہے۔ اس کے عملی نفاذ کے بعد جب اس تجربہ میں مزید اضافہ ہوگا تو وہ اس بنیاد تک بھی پہنچ جائے گا گی جس کے بغیر یہ عمارت استوار نہیں ہوسکتی۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کے پیش نظر روس کے متعلق کہا تھا کہ:

فکر او در تند بادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے الا نراند
آیدش روزے کہ از زور جنوں
خویش رازیں تند باد آید بروں

ترجمہ: اس کی فکر و تدبیر لا کی تیز آندھی میں پھنس کے رہ گئی۔ اس نے اپنی سواری کا رخ الا کی طرف نہ موڑا۔

ایک دن آئے گا جب وہ جنوں کے زور پر اپنے آپ کو اس تیز آندھی سے باہر نکال لے گا۔ اس لئے کہ:

در مقام لا نیاساید حیات
سوئے الا می خرامد کائنات

ترجمہ: لا کے مقام پر زندگی آسودگی نہیں پاتی۔ کائنات خود بخود الا کی طرف چل نکلتی ہے۔

بنیادی حقوقِ انسانیت:

ہمارے زمانے میں بنیادی حقوق انسانیت (Fundamental Human

Rights) کا بڑا چرچا ہے اور اقوام متحدہ (UNO) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ان حقوق کو متعین کر کے ان کا چارٹر شائع کر دیا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بنیادی حقوق کا تصور سب سے پہلے قرآن کریم نے دیا تھا اور انہیں نہایت وضاحت سے بیان بھی کر دیا تھا۔ قلت وقت کی بنا پر میں ان حقوق کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ اس لئے اجمالاً چند کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔ دیکھئے قرآن کریم کی رو سے وہ حقوق کیا ہیں:

(1) تکریم آدمیت: یعنی ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے۔

(2) جنسی مساوات: زندگی کے کسی شعبہ میں مرد اور عورت میں کوئی تفاوت نہیں۔

(3) مدارج کا تعین افراد کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی رو سے کیا جائے گا۔

(4) اطاعت صرف قانون کی ہوگی۔ اشخاص کی نہیں۔

(5) ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا حق ادا کیا جائے گا۔ اسے عدل کہا جاتا ہے اور جس شخص میں کوئی کمی ہوگی اس کی کمی پوری کی جائے گی۔ اسے احسان کہا جاتا ہے۔

(6) ہر شخص کو رزق (سامان زیست) مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔

(7) جان کی حفاظت کا حق۔

(8) جو چیز کسی کی ملکیت میں دی جائے اس کی حفاظت کا حق۔

(9) سکونت کا حق۔

(10) عصمت کی حفاظت۔

(11) شادی میں انتخاب کا حق۔

(12) حسن ذوق (Aesthetic Taste) کا حق۔

(13) مذہبی آزادی کا حق۔

(14) سچی بات کہنے کا حق۔

(15) مظلوم کو فریاد کا حق۔

(16) پرائیویسی کا حق۔

(17) حیثیت عرفی کے تحفظ کا حق۔

(18) اثبات جرم کے بغیر، ہر ایک کو بے گناہ تصور کئے جانے کا حق۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر حقوق کا تعین قرآن کریم نے اس زمانے میں کیا جب دنیا میں افراد کے حق کا تصور بھی کہیں نہیں تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسانی فکر نے ان حقوق کا تقاضا کیا ہے یا اس نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے! اور اگر اس نے ان حقوق کا مطالبہ کیا ہے تو کیا یہ اسلام کی کامیابی کی دلیل ہے یا اس کی ناکامی کا ثبوت؟ اسلام کی ناکامی تو ایک طرف، فکر انسانی اس باب میں بھی ہنوز اسلام سے پیچھے ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو ابدی اور غیر متبدل قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کا کوئی نظام ان میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس، اقوام متحدہ کے متعین کردہ حقوق کی کیفیت کیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ میں نے اس سے پہلے (Unesco) کے جس کمیشن کا ذکر کیا ہے اس نے، ان حقوق کے متعلق اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ یہ تمام حقوق بالآخر انسانی حقوق ہیں اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابل ترمیم و تبدل قرار دیا جائے۔ جبکہ جن حقوق کو بلا مشروط کہا جاتا ہے، ان میں بھی، ان حقوق کا مالک ہونے اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے۔ ملکیت بجا ہے لیکن ان کا استعمال ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر از روئے قانون عائد کی جائیں گی۔

اور ''از روئے قانون'' ان حقوق کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے اس کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں! یہی وجہ ہے کہ یونیسکو کے سوالنامہ کا جواب دیتے ہوئے شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر (Quincy Wright) نے کہا تھا کہ:

> تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں حقوق انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں۔ ان سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔

یہ اس لئے کہ دنیا کی ہر مملکت اپنے آپ کو اقتدار مطلق (ساورنٹی) کی مالک سمجھتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو پامال کر دے۔ تو اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہوگا۔ ان کے برعکس، قرآنی مملکت پر مستقل اقدار خداوندی کا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر فیصلہ اور عمل کے لئے قانونِ مکافات کی عدالت میں جوابدہ ہوتی ہے۔ فکر انسانی کا تجرباتی طریق ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا جس کی وجہ سے بنیادی حقوق کے چارٹر تو شائع ہو جاتے ہیں، ان پر عملدرآمد کہیں نہیں ہوتا۔

مسلمان یونہی کہہ دیتے ہیں:

اس مقام پر، عزیزانِ من! میں ایک اور اعتراض کی طرف آنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ عادت ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی اچھا نظریہ سامنے آیا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ اسلام میں یہ پہلے ہی موجود ہے۔ جب دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر صحیح نظریہ پہلے ہی سے اسلام کے اندر موجود ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے اور ان کی اس قسم کے دعویٰ کا ان کے پاس ثبوت کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں اور متعین اتھارٹی کی بنا پر کہتا ہوں۔ میری اتھارٹی قرآنِ کریم ہے جس کے متعلق ساری دنیا کو تسلیم ہے کہ وہ چودہ سو سال سے دنیا میں بغیر کسی تبدیلی کے موجود ہے۔ میں نے جو کچھ اس وقت کہا ہے (یا اس سے پہلے بھی جو کچھ کہتا چلا آ رہا ہوں) ان میں سے ایک ایک دعویٰ کی تائید میں قرآن کی آیات موجود ہے اور جب بھی کوئی طلب کرے انہیں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔

حقائقِ ابدی پر مدار ہے اس کا
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

غلط فہمی کی وجہ:

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ''اسلام آگے نہیں چلا'' جہاں تک میں نے غور کیا ہے، ان کی غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ وہ (ہم) مسلمانوں کو اور اسلام کو مرادف سمجھ لیتے ہیں اور اسی وجہ

سے پوری جرات کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ اگر اسلام میں فی الواقعہ ایسی صلاحیت موجود ہے جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو پھر مسلمانوں کی حالت اس قدر پست کیوں ہے؟ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کا سکہ بند جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اسلام میں تو اس کی صلاحیت موجود ہے لیکن ہم مسلمان اس پر کاربند نہیں۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن جب وہ پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے جس پر کاربند نہ ہونے سے مسلمانوں کی یہ حالت ہو چکی ہے تو اس کا جواب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ یہ نماز نہیں پڑھتے۔ روزے نہیں رکھتے، ان کی وضع قطع، تراش خراش سچے مسلمانوں جیسی نہیں۔ یہ شراب پیتے ہیں، فسق و فجور میں مبتلا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب معترضین یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ایسے مسلمان بھی تو ہیں جو نماز روزے کے بھی پابند ہیں اور فسق و فجور میں بھی مبتلا نہیں۔ پھر ان کی حالت بھی ویسی ہی کیوں ہے، تو اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

یاد رکھیئے! جب تک ہم اس اعتراف اور اعلان کی جرات نہیں کرتے کہ ہمارا مروجہ اسلام وہ اسلام نہیں جسے خدا نے متعین کیا تھا۔ اس وقت تک ہم نہ ان اعتراضات کا کوئی اطمینان بخش جواب دے سکتے ہیں نہ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ اسلام، خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) کے اندر محفوظ ہے۔ مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لینے کا نتیجہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے مشاہیر بھی، اسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یوں غیر شعوری طور پر مخالفین کے اعتراض کی تائید و تقویت کا موجب بن جاتے ہیں۔ اسلام نے خدا کے ایک اور قرآن کے ایک ہونے کا لازمی نتیجہ، مسلمانوں کا ایک قوم ہونا قرار دیا ہے اگر خدا کی وحدانیت اور اس کی کتاب کی یکتائیت پر ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود، یہ قوم امت واحدہ نہیں ہے جس میں، خدا اور قرآن پر ایمان کے دعویٰ کے باوجود، مسلمان مختلف قومیتوں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ قائداعظمؒ سے بھی یہ سوال کیا گیا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر اختلافات اور تفرقات ہیں۔ ان میں وحدت کی صورت کیا ہوگی، تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ جب ہمارا خدا ایک، رسول ایک اور قرآن ایک ہے تو ہم ایک اُمت کیوں نہیں بن سکیں

گے۔ اس سے ان کا مطلب یہی تھا کہ جب ہم اپنی مملکت میں مستقل اقدار خداوندی کو بطور ضابطہ حیات نافذ کریں گے اور اس طرح مسلمانوں کو وحدت خداوندی کی عملی تعلیم دیں گے تو کیا وجہ ہے کہ ہم ایک اُمت نہیں بن سکیں گے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ایک خدا اور ایک قرآن کے ماننے کے باوجود مسلمانوں کی مختلف مملکتیں ہوسکتی ہیں، تو یہ ٹھیک ہے کہ جغرافیائی اور مقامی حالات کے تقاضوں کی رو سے، ایک سے زیادہ مملکتیں باقی رکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت محض انتظامی وحدتوں کی ہوگی۔ جب ان تمام مملکتوں کا ضابطہ حیات اور دستور ایک (یعنی قرآن) ہوگا تو ان میں باہمی اختلاف وافتراق کیسے ہوگا یہ ہوگی مختلف مملکتوں کی پوزیشن، وحدت خداوندی پر ایمان کی صورت میں۔ لیکن مروجہ اسلام میں تو حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کی مملکتیں سیکولر نظام کی مدعی ہیں اور اس کے باوجود وہ دعویٰ کرتے ہیں اور ہم اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ خدا کی وحدت پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کی یکتائیت پر بھی۔ یاد رکھیئے! اگر خدا کی توحید پر ایمان کے دعویٰ کا نتیجہ اُمت کی وحدت نہیں تو قرآن کریم، خدا پر اس قسم کے ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ آپ دنیا میں دیکھئے۔ چند دھریوں کو چھوڑ کر سارے انسان خدا کو مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں اس قدر اختلافات اور افتراقات ہیں۔ اگر محض خدا کو خدا، یا ایک خدا کو مان لینے سے وحدت انسانیت پیدا ہوسکتی تو پھر ان خدا پرستوں میں اس قدر اختلافات کیوں ہوتے؟ اور اگر آپ دنیا بھر کے خدا پرستوں کی بات نہ بھی کرنا چاہیں، تو صرف مسلمانوں کو لے لیجئے۔ ان کا تو ایک خدا پر ایمان ہے۔ پھر ان میں اس قدر اختلافات کیوں ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہم خدا پر ایمان لانے کے عملی مفہوم کو سمجھے ہی نہیں۔ دورِ حاضر کا عظیم سائنٹسٹ ایڈنگٹن، اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:

> اصل سوال خدا کی ہستی پر اقرار کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے۔
>
> (Science and the un-seen world)

لہٰذا، خدا کو ماننے کے معنی ہیں اس کی طرف سے نازل کردہ وحی کو ماننا۔ لیکن جس انداز سے

ہم وحی (قرآن) کو مانتے ہیں، وہ بھی قرآن کا ماننا نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) وہ لوگ بھی ہیں جو اس کا دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتے۔ قرآن پر ایمان کے معنی کیا ہیں، اسے قرآنِ کریم ایسے واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی وہ کہتا ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)

جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہتے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ خدا پر ایمان کے معنی ہیں اس کتاب پر ایمان رکھنا اور اس کی کتاب پر ایمان کا عملی مفہوم ہے اس کے مطابق حکومت قائم کرنا، یہی کفر و ایمان کا معیار ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جن مملکتوں کا بنیادی ضابطہ قوانین ایک ہو، ان میں وحدت ہوگی یا نہیں! قرآن کریم نے ضابطۂ حیات کی وحدت کو صرف مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بتایا۔ اس نے کہا ہے کہ اس سے عالم انسانیت میں وحدت ہو جائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق (جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں) ایرک فروم نے کہا ہے کہ ''وہ مذہب منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔'' یہ ہے خدا کی توحید اور قرآن کی وحدت پر ایمان لانے کا حقیقی مفہوم۔ ہماری غلط نگہی، اور ہمیں دیکھ کر ان لوگوں کی بھی غلط نگہی جو اسلام کو ایک چلا ہوا کارتوس سمجھتے ہیں، یہ ہے کہ ہم اسلام کو مذہب سمجھتے ہیں، اور مذاہب کے متعلق یہ حقیقت ہے کہ، کوئی ایک مذہب نہیں بلکہ سب مذاہب، چلے ہوئے کارتوس ہیں۔ پروفیسر (Hocking) کے الفاظ میں:

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادث زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینان خویش نے (جو درحقیقت فریب نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آسکتی) ان کے عقائد و نظریات کے زنگ نے ان

کے افکار واعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔

(Living religions and a world faith)

لہٰذا جب تک اسلام کو مذاہب کی صف سے نکال کر، دین (ضابطہ حیات) کی حیثیت سے نہیں سمجھا جائے گا، اس کے زندہ جاوید ہونے کی حقیقت سمجھ میں نہیں آ سکے گی۔ اسلام، مذہب کی چند رسوم کا مجموعہ نہیں۔ وہ زندگی کے غیر متبدل اصول و اقدار کا ضابطہ ہے۔ یہ غیر متبدل اصول قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں اور وہ برابر آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

اسلام ہی غالب رہے گا:

قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خدا نے الحق پر مبنی دین (نظامِ حیات) اس لئے بھیجا ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) تاکہ وہ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظام حیات پر غالب آ کر رہے۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ تھی جس کے پیش نظر گوئٹے نے (Eckermann) سے کہا تھا کہ:

> اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظام ہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ (بحوالہ خطبات اقبالؒ)

میں نے اس مختصر سی نشست میں اسلامی نظام کے جس قدر اصول آپ کے سامنے پیش کئے ہیں، آپ سوچئے کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ رفتہ رفتہ وہی اصول، انسانوں کے خود ساختہ اصولوں کی جگہ لے رہے ہیں! چونکہ یہ اصول ابدی ہیں اس لئے یہ بھی نہیں کہ انہوں نے کسی خاص زمانے میں تو اپنے انسانیت ساز نتائج مرتب کئے ہوں اور اس کے بعد یہ درخت سوکھ گیا ہو۔ ان اصولوں کے متعلق کہا یہ ہے کہ مثلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (14:24) ان کی مثال اس پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ

(14:25) یہ شجر طیب ہر موسم میں پھل دیتا جائے گا۔ کبھی خشک نہیں ہوگا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں محتاج
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

نہ ہی یہ اصول یہودیت کی طرح کسی خاص نسل یا قوم کے اندر محدود و محصور رہنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ قرآن ذکر للعالمین ہے۔ یعنی تمام اقوام عالم کے لئے ضابطہ حیات۔ اگر کوئی قوم انہیں اپنانے کے بعد چھوڑ دے، تو یہ اصول معطل ہو کر نہیں رہ جاتے۔ انہیں جو قوم اپنا لے گی، ان کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہوگی۔ اس نے خود مسلمانوں سے برملا کہہ دیا تھا کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ (47:38) اگر تم نے ان سے منہ موڑ لیا تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے گی۔ اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

1۔ محفل ما بے مے و بے ساقی است
ساز قرآں را نواہا باقی است

2۔ زخمۂ ما بے اثر افتد اگر
آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

3۔ ذکر حق از امتاں آمد غنی
از زمان و از مکاں آمد غنی

4۔ ذکر حق از ذکر ہر ذاکر جداست
احتیاجِ روم و شام او را کجاست

5۔ حق اگر از پیش ما بر دارد ش
پیش قومے دیگرے بگذارد ش

ترجمہ:

(1) ہماری محفل شراب اور ساقی کے بغیر ہے، مگر قرآن کے ساز کے نغمے اپنی جگہ برقرار ہیں۔

(2) اگر ہماری مضراب میں کوئی اثر نہیں رہا تو آسمان کے پاس ہزاروں اور سازندے موجود ہیں۔

(3) خدا تعالیٰ کا ذکر قوموں سے بے نیاز ہے۔ وہ زمان اور مکان دونوں سے بے نیاز ہے۔

(4) ذکرِ حق ہر ذاکر کے ذکر کرنے سے الگ (اس کی اپنی الگ حیثیت ہے) اسے روم اور شام کی کیا حاجت ہے یعنی کوئی ضرورت نہیں۔

(5) اگر اللہ تعالیٰ اسے (قرآن کو) ہمارے سامنے سے اٹھالے تو وہ اسے کسی اور قوم کے سامنے رکھ دے گا۔

یاد رکھئے! دنیا کی کوئی قوم نہ خدا کی چاہتی اولاد ہے، نہ سوتیلی۔ وہ رب العالمین ہے، تمام اقوام کا نشوونما دینے والا۔ اس لئے جو قوم بھی اس کے عطا کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہوگی، ان کے نتائج سے بہریاب ہوجائے گی۔ جو انہیں چھوڑ دے گی ذلیل وخوار ہوجائے گی۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

ترجمہ: یہ شراب خانہ ہے اور یہاں سب کو کھلی دعوت ہے یہاں پیالے کی استعداد دیکھ کر شراب بانٹی جاتی ہے (ہر شخص اپنے ظرف (حوصلہ) کے مطابق شراب (کامیابی) حاصل کرسکتا ہے۔ پہلے زمانے میں مے نوشوں کو ان کے ظرف کے مطابق شراب دی جاتی تھی۔

حرفِ آخر:

جو کچھ میں نے آپ احباب کی خدمت میں پیش کیا ہے، آخر میں اسے چند ایک الفاظ میں دہرا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا میں آپ کو جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے۔ یہ صدقہ ہے خدا کی اس رحمت کا جسے اس نے تمام اقوام عالم کے لئے عام کردیا تھا۔ (وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (21:107)) دنیا، قرآنی اصولوں اور ان کی روشنی میں متشکل کردہ قرآن کے نظام کے کئی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے۔ بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کررہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ آگے چل کر اپنائے گی۔ اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی

نشوارتقاء کی تکمیل تک پہنچ سکتی ہیں، نہ حسن کائنات میں نکھار پیدا ہوسکتا ہے۔ لہٰذا، بزم ہستی میں جہاں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتاب عالمتاب کی ضیا باریوں کا صدقہ ہے اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول کھلتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جان بہار کی نگہت پاشیوں کا رہین منت ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یاز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ (ﷺ) است

ترجمہ: (اے زندہ رود) تو جہاں کہیں رنگ و بو کی دنیا دیکھتا ہے اور ہر وہ جہان جس کی خاک سے آرزو پھوٹتی ہے یعنی پیدا ہوتی ہے۔ یا تو اس کی قدر و قیمت حضرت محمد ﷺ کے نور سے ہے یا پھر ابھی تک وہ مصطفیٰ ﷺ کی تلاش میں ہے۔ یعنی اس فضا میں جتنے بھی اور جہان ہیں وہ یا تو حضور اکرم ﷺ کے نور سے منور ہو چکے ہیں یا اگر ابھی تک کوئی جہان اس نعمت سے محروم ہے تو وہ اس نورِ مبارک کی تلاش میں ہے تا کہ وہ مکمل اور بامقصد ہو جائے۔

(غلام احمد پرویزؒ)

(مطبوعہ طلوعِ اسلام، فروری 1973ء)